© rasailojaraid.com

سید افتخار حسین شاہ

تاریخ ساز اقبال، معلّمِ تاریخ اور مورّخ کی حیثیت سے

انسان چاند پر اپنا نقشِ قدم ثبت کر چکا لیکن کائنات کی وسعتیں اب بھی اس کے لیے لامحدود ہیں۔ اس کے سامنے سیکڑوں آسمان ہیں، کئی جہان ہیں۔ کچھ انسان کی دست رس میں ہیں اور کچھ انسان کی پروازِ تخیّل سے بھی دور، بہت دور۔ ان کو سمجھنے کے لیے، ان کی تسخیر کے لیے انسان نے کبھی حواسِ خمسۂ ظاہری سے کام لیا اور کبھی حواسِ خمسۂ باطنی کا سہارا ڈھونڈا۔ کبھی کامیابی سے ہم کنار ہوا اور خدا کے مقابلے میں اپنی فتح کا نعرہ اس طرح لگایا:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (اقبال)

اور کبھی ناکامی کے قعرِ گم نامی میں گم ہوتے ہوئے اپنی شکست اور مجبوری کو اس طرح بیان کیا:

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے — جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے (نظیر اکبرآبادی)
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)

مجبور و مختار اور بیابان و خیابان کی اس دنیا میں تضادات ہیں۔ بوقلمونی ہے، تنوع ہے، ایک دوسرے سے مختلف ایک ہی درخت پر لاکھوں پتے صاحبِ نظر کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ایک ہی آدم کی اولاد۔ کروڑوں انسان، سب کے ہاتھوں کے نشان ایک دوسرے سے بالکل جدا۔ نہ تن ایک جیسا نہ من ایک جیسا۔ اس عالمِ رنگ و بو کے گوناگوں مظاہر ہیں۔ زندگی کے کئی روپ ہیں، کئی شکلیں ہیں، بہت سے مراحل ہیں، بہت سے پہلو ہیں، سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ہے۔ اس کارخانۂ قدرت میں سکون محال ہے۔ ثبات صرف تغیّر کو حاصل ہے۔ زندگی دمادم رواں ہے۔ حال کا لمحہ ماضی سے ہم آغوش ہے، اور انسان کے اقوال و افعال سے تاریخ کا تانا بانا بن رہا ہے۔ اقوال میں بھی رنگا رنگی ہے اور افعال میں بھی۔ خواہشات الگ الگ ہیں اور ضرورتیں جدا جدا۔ اس سے پھیلاؤ میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ جب ہر گلے لا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنگ و بوئے دیگر است" کی صورت سامنے ہو اور "پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی" پر عمل ہو تو طرح طرح کے اختلافات اور مسائل کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ الجھن کو سلجھانا اور مسائل کو حل کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ قدرت کی طرف سے سب کو صلاحیتیں اور وسائل بھی ایک جیسے ودیعت نہیں کیے گئے ہیں۔ کاروانِ حیات کو اس مرحلے پر قافلہ سالار کی ضرورت پیش آتی ہے، راہ رو راہنما تلاش کرتا ہے۔ مولانا روم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کہ از دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت نشود آنم آرزوست

آرزو کی تکمیل کی صورت کم ہی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر یہ کہنا پڑتا ہے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔

لیکن ملتِ اسلامیہ کی بالعموم اور مسلمانانِ برصغیر کی بالخصوص خوش قسمتی تھی کہ مولانا روم نے جس آرزو کا اظہار کیا تھا، وہ علامہ اقبال جیسے بطلِ جلیل کی صورت میں بر آئی۔ علامہ کو اپنی زندگی میں جلد ہی روشنی کے ایک ایسے مینار کی حیثیت حاصل ہو گئی کہ جس سے بغیر کسی امتیاز کے ہر قسم کے انسان انفرادی اور اجتماعی صورت میں کسبِ ضیا کرنے لگے۔ لوگوں نے ان کو ایک عظیم شاعر ہی نہیں، ایک عظیم راہنما بھی تسلیم کر لیا۔ ہر ملی بحران میں ان سے مشورہ کیا گیا۔ وہ ہر آزمائش میں سرخرو رہے۔ جس طرح زندگی کا میدان وسیع ہے، اسی طرح ان کی راہنمائی کی جولان گاہ بھی طویل و عریض تھی۔ لوگ ہر طرح کے مسائل کو لے کر ان کے سامنے آتے تھے اور وہ خندہ پیشانی سے ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں دلمے، درمے، قدمے، سخنے، غرضیکہ بوقتِ ضرورت ہر قسم کی قربانی پیش کرتے تھے۔ انھوں نے جہاں مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم[1] اور معروف شاعر جوش ملیح آبادی[2] جیسے افراد کو ملازمت دلوانے کے لیے سفارشی خطوط لکھ کر ان لوگوں کے ذاتی اور معمولی مسائل حل کیے، وہاں شیخ عبداللہ جیسے قومی کارکن اور راہنما کو ذاتی مفاد اور قومی مفاد میں امتیاز کرنے کا ان الفاظ میں احساس بھی دلایا۔

"یہ تمھارے خطوط پڑے ہیں، انھیں لے جاؤ۔ میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے

---

[1] اوراقِ گم گشتہ۔ مرتبہ شیخ رحیم بخش شاہین۔ ص ۱۵۹
[2] اقبال نامہ، حصہ دوم۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ص ۲۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لیے ٹکے ٹکے کے لوگوں کے پاس جاؤں[۵۳]

ملّی خدمات کے لیے ان کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں تھا، انھوں نے افغانستان کے حالات بہتر بنانے اور وہاں مستحکم حکومت کے قیام کے لیے جنرل نادر شاہِ افغانستان کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا۔ شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ "اقبال نامہ" میں شامل کئی خطوط سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ فلسطین کے مسائل حل کرنے میں بھی انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مس فرقوہرسن (FARQUHARSON) کے نام مکاتیب میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے[۵۴]۔ سیاست کے میدان میں انھوں نے قوم کی جس قابلِ ستائش صورت میں راہنمائی فرمائی اور پاکستان کے قیام کے لیے فضا ساز گار بنائی، اس کی ترجمانی اور عکاسی قائداعظم کے نام خطوط سے بخوبی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تادمِ آخر ان کی دوسروں کے کام آنے کی وہی خواہش اور کوشش رہی، جس کا اظہار انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں بچوں کے لیے ایک نظم "ہمدردی" لکھتے ہوئے اس شعر میں کیا تھا:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے

علامہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو اپنی یادگار ایک ایسا علمی اور ابدی خزانہ چھوڑ گئے کہ جس سے سبھی انسان قیدِ زمان و مکان سے آزاد اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی جھولیاں بھر سکتے ہیں۔ ان کی مشہور و مقبول اردو نظم "ساقی نامہ" چینیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے لیے پہلے بھی قابلِ توجہ تھی، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ مذہب، سیاست، اقتصادیات، ادب، سائنس، تاریخ، کسی بھی موضوع پر تحقیق مطلوب ہو، ملی مفاد اور انسانیت کے ضامن راہنما خطوط ان کی تحریروں میں مل سکتے ہیں۔ علامہ کی اور ان کے ارشادات کی یہی وہ اونچی حیثیت ہے، جس کے پیشِ نظر مولانا گرامی جیسے جلیل القدر شاعر اور جوہر شناس نے یہ فرمایا تھا:

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال　　　پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

اقبالیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے صرف شاعری کی صورت میں پیغمبری نہیں کی، بلکہ وہ جس راہ پر بھی چلے، پیغمبرانہ انداز سے چلے۔ تعلیم و تدریس کو پیشۂ پیغمبری کہا جاتا ہے۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں

---

۵۳ اوراقِ گم گشتہ ۔ مرتبہ رحیم بخش شاہین ۔ راوی مولانا علم الدین سالک، ص ۳۵۳

۵۴ اقبال نامہ حصہ اوّل ۔ ص ۴۴۵ تا ۴۵۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایم۔اے کرنے کے بعد یہی عمدہ پیشہ اپنایا اور اس صورت میں تاریخ سے ان کا تعلق پہلی بار منظرِ عام پر آیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار[۵۵] کے مطابق علامہ بی۔ او۔ ایل کے سال اوّل اور سال دوم کی جماعتوں کو J. R. SEELEY کی تصنیف EXPANTION OF ENGLAND پڑھانے کے علاوہ ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کے متعلق نوٹس لکھواتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۲-۱۹۰۱ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے W. STULTS کی تصنیف EOWLY PLANTOGENETS کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کا خلاصہ لکھا تھا۔ بی۔ او۔ ایل کی جماعتوں کو تاریخ اور اقتصادیات پڑھانے کے علاوہ انٹرمیڈیٹ سال دوم کی کلاس کو وہ فلسفہ بھی پڑھاتے تھے۔ تین مختلف کلاسوں کو تین مختلف مضامین پڑھانا اور پھر اس کے ساتھ تینوں مضامین میں تصنیف و تالیف کا کام کرنا معمولی بات نہیں۔ اس دور کی اہم شخصیتوں سے خط و کتابت اور مختلف امتحانات کے پرچے جانچنے کا کام اس کے علاوہ تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس سال مجھے امید نہ تھی کہ میں کوئی نظم پڑھ سکوں گا۔ مڈل کے امتحان کے پرچوں سے فراغت نہ ہوئی، طبیعت کو یکسوئی کس طرح نصیب ہوتی۔ یہ نظم جلسہ سالانہ سے تین روز پہلے لکھی گئی اور ہفتے کی شام کو مطبع میں بھیجی گئی۔ رات کو کاتب نے لکھی اور جلدی میں بندوں کی ترتیب میں غلطی کر گیا۔

ایف۔ اے کے امتحان کے پرچے مضمون تاریخ یونان و روم کے دیکھ رہا ہوں۔ سامنے بنڈل رکھا ہے اور نتیجہ بھیجنے میں چار دن کا عرصہ باقی رہ گیا ہے لہٰذا مجبوراً بس کرتا ہوں، معاف کیجیے گا۔"[۵۶]

اس سے خلوص، لگن، محنت، دیانت اور فرض شناسی کا ایک قابلِ تقلید نمونہ سامنے آتا ہے۔ ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والے نوعمر مجلسی معلم سے اس قسم کی مصروفیت کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ معلم کو جب تک یہ احساس نہ ہو کہ وہ بہترین پیشے سے وابستہ ہے، معمول کا تدریسی کام کرنے کے علاوہ وہ تحقیقی اور علمی کام نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو اپنے پیشے کے تقاضوں کا بخوبی علم تھا۔ تاریخ پڑھاتے ہوئے جن دو مغربی مورخین کی تصانیف ان کی توجہ کا مرکز بنیں، اس مرحلے پر ان کے اندازِ فکر کا مختصراً جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہیں۔

۱۔ جان رابرٹ سیلی (۱۸۳۴ء تا ۱۸۹۵ء) ایک ایسا انسان ہے کہ جس کی تحریریں خیالات سے پُر ہیں

---

۵۵ مطالعۂ اقبال۔ گوہر نوشاہی (تفصیلات کے لیے اس مجموعے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون دیکھیے۔ ص ۴۷ تا ۵۷

۵۶ اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص ۹-۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہے اور خواہ تاریخ سے، وہ حقائق کے متعلق تفتیش و تحقیق کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور بعض مسلسل حقائق کو سامنے رکھ کر ان سے نتائج تک جا پہنچتا ہے، عام اصول وضع کرتا ہے۔

اس کی تاریخی تصانیف میں سب سے عمدہ EXPANTION OF ENGLAND اور GROWTH OF BRITISH POLICY ہیں۔ جب سیلی کے بہت سے ہم عصر مورخین ملکی سیاست کے متعلق غور و فکر کر رہے تھے، وہ بین الاقوامی امور کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کے حالات کا دوسرے ممالک کے حالات سے موازنہ کرتا تھا۔ وہ دوسرے مورخین کی طرح اپنے ہی گھر کا ہر کمرہ پوری تفصیل کے ساتھ دکھانے کا قائل نہیں تھا، اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنے گھر کے کمروں سے باہر گھر کے چمن میں بیٹھ کر اپنے گھر کا دوسرے گھروں سے موازنہ کیا جاتے۔ نوآبادیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ سامراجی نظام کی حمایت میں اعتدال پسند نظر آتا ہے۔ اس کی تحریروں میں جو فلسفیانہ قدامت پسندی کا ایک نمایاں پہلو ہے وہ مبارزت طلب اور جاذبِ توجہ ہے، رجعت پسندانہ نہیں۔

سیلی کے متعلق A HISTORY OF ENGLISH LITERATURE میں اس کے مصنف ARTHUR COMPTON RICKETT. کے مندرجہ بالا بیان میں مندرجہ ذیل پہلو قابلِ توجہ ہیں:

ا۔ سیلی نے مذہب اور تاریخ سے متعلق قلم اٹھایا اور افکار ان کی تحریروں میں غالب ہے۔

ب۔ اس کی پیش کش میں موازنے کا انداز تھا۔

ج۔ اس کی تحریروں میں فلسفیانہ قدامت پسندی کے باوجود رجعت پسندی نہیں۔

۲۔ ولیم سٹبز (۱۸۲۵ء تا ۱۹۰۱ء) کا تعلق عہدِ وکٹوریہ کے مورخین کے اس دبستانِ فکر سے تھا جسے سائنس میں سائنسی دبستان قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے تین جلدوں میں جو CONSTITUTIONAL HISTORY OF ENGLAND تحریر کی، اسے اس کے علم و فضل کا ایک شاہ کار سمجھا جاتا ہے۔ شہری زندگی کا ارتقا دکھانے، بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کرنے اور قرونِ وسطیٰ کے چرچ (MEDIAEVAL CHURCH) کی قوت کے اظہار میں کوئی بھی اس کا ہم سر نہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کی تاریخوں میں غیر ضروری تفصیلات کا نقص موجود ہے جن کی حیثیت ان ہڈیوں جیسی ہوتی ہے، جو زندگی کی حرارت سے محروم ہوں اور جن کی اہمیت صرف سائنسی نقطۂ نظر سے ہو سکے۔

A HISTORY OF ENGLISH LITERATURE By ARTHER COMPTON RICKETT ۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اس کے خطبات کے علاوہ اس کی مختصر تصانیف میں THE EARLY PLANTAGENETS شامل ہے۔ اس کتاب میں اس خاندان کے حکمرانوں کا ذکر ہے جس نے ۱۱۵۴ء سے ۱۳۹۹ء تک انگلستان میں حکومت کی۔ جس کا پہلا بادشاہ ہنری دوم تھا اور آخری رچرڈ سوم۔ STUBBS ۱۸۸۴ء میں CHESTER کا اور ۱۸۸۸ء میں آکسفورڈ کا بشپ مقرر ہوا تھا"[۵۸]

مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ STUBBS بنیادی طور پر ایک مذہبی قسم کا انسان تھا اسے انگلستان کے اس قدیم دور میں دلچسپی تھی جس میں چرچ کو غلبہ حاصل تھا۔ وہ معلومات کے خزانے کا مالک تھا۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اورینٹل کالج میں ملازمت کے دوران دیارِ غیر کے جس قسم کے مصنفین کی تصانیف پڑھانے کے علامہ کو مواقع ملے انہی دنوں میں ویسا ہی ایک مورخ شبلی کے روپ میں انھیں اپنے وطن میں مل گیا۔ شبلی بھی مذہب کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسند تھے، لیکن رجعت پسند نہیں۔ مبارزت طلبی ان کی بھی مشہور ہے۔ ان کا طریقِ کار بھی موازنے کا تھا۔ ان کی دلچسپی بھی صرف اپنے ملکی حالات تک نہیں تھی۔ وہ بین الاقوامی امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ معلومات کا خزانہ بلاشبہ ان کے پاس بھی تھا۔[۵۹] شبلی کا مقام تاریخ نگاری میں بھی مسلمہ ہے۔ بقول اختر وقار عظیم "شبلی کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں میں مورخ شبلی نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو اس کے مقابلے میں مدھم پڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سب سے بڑے پرستار مہدی نے بھی جو انھیں "خاتم المصنفین" اور "مورخ اسلام" کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ تسلیم کر لیا تھا کہ شبلی سے اگر تاریخی کتب لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔[۶۰]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مورخ شبلی کو اس کی عظمت کے باوجود شبلی کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں سے الگ نہیں کیا جا سکتا، ان کی شخصیت کے مختلف پہلو فنی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم سر نہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں اس حد تک پیوست ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ شاعر شبلی کو مورخ شبلی سے، نقاد شبلی کو عالم شبلی سے، متکلم شبلی کو سوانح نگار شبلی سے علیحدہ کر کے دیکھنا حقائق کی طرف سے چشم پوشی ہے۔[۶۱]

---

۵۸ COLLINS NATIONAL ENCYCLOPEDIA, P. 15

۵۹ یادگارِ شبلی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ص ۶۷ تا ۶۸

۶۰ افاداتِ مہدی۔ مہدی افادی، ص ۲۱۲

۶۱ شبلی بحیثیت مورخ۔ اختر وقار عظیم، ص ۶۷، ۶۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال بھی جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ وہ شاعر تھے، معلم تھے، وکیل تھے، رہنما تھے، مضمون نگار تھے، مقرر تھے، مکتوب نگار تھے، نقاد تھے، محقق تھے، مورخ تھے، اسی طرح سے ان کی شخصیت کے کئی مختلف پہلو تھے، جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ الگ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب ایک ہی تنومند درخت کے برگ و بار ہیں۔ ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے یا ان مختلف راہوں پر چلنے کا محرک جذبہ شبلی اور اقبال کے ہاں ایک ہی تھا۔ اسی کی وجہ سے شبلی "مورخ اسلام" بنے اور اقبال "شاعرِ اسلام"۔ دونوں کا مرکزِ نگاہ ایک تھا۔ مختلف راہوں پر چلتے ہوئے بھی یا ایک ہی راہ پر ہم سفر بنتے ہوئے دونوں ایک ہی منزل پر پہنچنے کے خواہاں تھے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا، شعر کہتے ہوئے بھی، نثر لکھتے ہوئے بھی۔ اس سلسلہ میں شبلی پیش رو نظر آتے ہیں اور اقبال پیرو۔ اور یہ کوئی خلاف توقع بات بھی نہیں، کیوں کہ:

دو راہرو کہ بیک راہ می روند و یک سمت
عجب نباشد اگر او فتند پے در پے

مولانا شبلی جیسی ہمہ گیر اور متاثر کرنے والی شخصیت سے علامہ اقبال کے رابطے کی پہلی صورت یہ نظر آتی ہے کہ اقبال کی مشہور کتاب علم الاقتصاد کے بعض حصوں میں علامہ شبلی نعمانی نے زبان کے متعلق قابلِ قدر اصلاح دی۔[۱۲]

شبلی سے استفادے کی صورت صرف علم الاقتصاد تک محدود رہی ہو، میرے خیال میں یہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ علامہ اقبال کی تحریروں میں شبلی کی تصانیف کے حوالے ملتے ہیں۔ مثلاً "فلسفہ عجم" میں "علم الکلام" کے اقتباسات موجود ہیں۔ بعض مکاتیب میں شعر العجم کی اہمیت تسلیم کی ہے[۱۳] اور دوسروں کو اس سے فیض حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں مگر مسلمان امرا میں مذاقِ علمی مفقود ہو چکا ہے، میری کوشش بارآور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے۔ مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ یہ سلسلہ بھی جاری رکھتے۔

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال مولانا شبلی کے تاریخی ذوق سے صرف آگاہ ہی

---

۱۲ آثارِ اقبال، مرتبہ غلام دستگیر رشید، ص [illegible]

۱۳ اقبال نامہ، حصہ اوّل، ص ۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں، بلکہ متاثر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کو تاریخی واقعات کو نظم کرنے کا سلسلہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

اس خط کا تعلق ۱۹۱۶ء سے ہے۔ اقبالیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کو شبلی کی راہ پر چلنے کا مشورہ دینے سے پہلے وہ خود اس راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ تاریخ میں ان کی دلچسپی تاریخ کا معلم اور ممتحن ہونے کے علاوہ مورخ کی حیثیت سے بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ فقیر وحید الدین روزگارِ فقیر کی جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ علامہ نے اردو زبان میں تاریخِ ہند لکھی تھی جو ۱۴-۱۹۱۳ء میں مڈل کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کتاب کا خلاصہ امرتسر کے ایک پبلشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا تھا۔ وہ جناب ممتاز حسین کی لائبریری میں محفوظ ہے، اصل کتاب نایاب ہے۔ داخلی اور خارجی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کا معلم ہونے کی حیثیت تو تادیر قائم نہ رہ سکی، دوسرے امور کی طرف توجہ بڑھ گئی، لیکن شبلی کی تاریخی نوعیت کی تخلیقات سے برصغیر میں جو علمی اور ادبی فضا پیدا ہوئی تھی، اس کا اثر تا دمِ مرگ باقی رہا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رسمی صورت میں معلم کی حیثیت سے کلاس روم میں تاریخ کی نصابی کتب پڑھانے کا سلسلہ ۱۹۰۵ء میں اس وقت ختم ہو گیا جب علامہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے لیکن غیر رسمی صورت میں سامعین اور قارئین کے اپنے وسیع تر حلقے کے سامنے علامہ تاریخ کے فلسفے اور کسی قوم یا ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار اور پہلوؤں کے متعلق اظہارِ خیال تمام عمر فرماتے رہے، ماحول اور محرکات مختلف ہونے کی وجہ سے اظہارِ خیال کی صورتوں میں تبدیلی رونما ہوتی رہی اور تاریخ ساز اقبال معلم اور مورخ کی صورت میں اپنی جھلکیاں دکھاتا رہا۔

تاریخ کے فلسفے اور اس کے فنی تقاضوں کے سلسلے میں علامہ کی وہ تحریریں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو اُن کی ذاتی ڈائری میں ملتی ہیں۔ علامہ نے اپنی ڈائری ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی اور اُسے ان کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے آج سے چند سال پہلے شائع کیا تھا۔ شذراتِ فکرِ اقبال کے نام سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اسے اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ اس ڈائری میں ہمیں تاریخ کی تعریف ان خوب صورت الفاظ میں ملتی ہے "تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے، جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔"[۱۳]

تاریخی مواد کو احتیاط سے استعمال کرنے کا مشورہ بدیں الفاظ پیش کرتے ہیں "تاریخ محض انسانی محرکات کی توجیہہ و

---

[۱۳] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی — شذراتِ فکرِ اقبال، ص ۱۴۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر ہے، لیکن جب ہم اپنے معاصرین بلکہ روزمرہ زندگی میں گہرے دوستوں اور رفیقوں کے محرکات کی بھی غلط توجیہیں کر بیٹھتے ہیں تو جو لوگ ہم سے صدیوں پہلے گزرے ہیں، ان کے محرکات کی صحیح تعبیر و توجیہہ اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے، لہٰذا تاریخ کی روداد کو بڑے احتیاط سے تسلیم کرنا چاہیے۔"[۱۵]

تاریخی پس منظر سے تصورات کے رشتے کی اس طرح وضاحت فرماتے ہیں" فکری ارتقا کو انسانی فضیلت کے دیگر پہلوؤں سے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ فلسفہ کی کتابیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف قوموں نے کیا سوچا ہے، لیکن ان مختلف معاشرتی اور سیاسی اسباب و عوامل کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں، جن سے فکرِ انسانی کا کردار متعین ہوا ہے۔ فلسفے کی جامع تاریخ مرتب کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔ لوتھر کی تحریکِ اصلاح کے قیمتی مضمرات کی ممکن وضاحت و صراحت کرنا محض ایک عالمِ دینیات کے بس کی بات نہیں۔ ہمارا یہ رویہ رہا ہے کہ عظیم تصورات کو انسان کی ذہنی فطرت کے عمومی دھارے سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔"[۱۶]

تاریخ اور اخلاقیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "تاریخ ایک قسم کی اطلاقی اخلاقیات ہے۔ اگر اخلاقیات دیگر علوم کی طرح ایک تجرباتی علم ہے تو اسے انسانی تجربے کے انکشافات پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس نظریے کے اعلانِ علم سے یقیناً ان لوگوں کے احساسات کو بھی صدمہ پہنچے گا جو اخلاقی امور میں بڑے کٹر پن کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا عام برتاؤ تاریخ کے تجربات و تعلیمات سے متعین ہوتا ہے۔"[۱۷]

برصغیر کے مختلف ادوار یا حکمرانوں کے متعلق جو شذرات ڈائری میں شامل ہیں، وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی عمدہ کوششیں ہیں۔ ان کی افادیت اور اہمیت آج بھی تاریخ کے طالب علم کے لیے بہت ہے۔ اورنگ زیب کے متعلق یہ شذرہ دیکھیے، جس میں موازنے کی صورت بھی نمایاں ہے۔

اورنگ زیب (۳۱): اورنگ زیب کی سیاسی فطانت بغایت ہمہ گیر تھی۔ اس ملک کی مختلف قومیتوں کو ایک عالمگیر سلطنت کے تصور میں شامل کر لینا گویا اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ لیکن اس سامراجی وحدت کے حصول میں اس نے غلطی سے اپنے غیر متزلزل عزم و ہمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا، جس کے پس پشت سیاسی تجربہ ناکافی تھا۔ اپنی منصور سلطنت کے سیاسی ارتقا میں وقت کے پہلو کو نظر انداز کر کے اس نے ہندوستان کی بیشتر اور بے ربط سیاسی وحدتوں کو اپنی ہی زندگی میں مجتمع کر دکھانے کی توقع پر ایک لامتناہی مہم شروع کر دی۔

---

[۱۵] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۳۰
[۱۶] ایضاً، ۱۱۱
[۱۷] ایضاً، ص ۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح سکندر پورے ایشیا پر یونان کو مسلط کرنے میں ناکام رہا، اسی طرح وہ بھی ہندوستان بھر کو پرچم اسلام کے نیچے نہ لا سکا۔ انگریز قدیم اقوام کے سیاسی تجربات سے پوری طرح مسلح ہو کر آیا تھا۔ اس کا صبر و تحمل اور چھوٹے کا سا استقلال وہاں کامیاب رہا، جہاں اورنگ زیب کی جلد باز فطانت ٹھوکر کھا کر رہ گئی تھی۔ سیاسی فتح لازماً اتحاد کے ہم معنی نہیں۔ علاوہ ازیں سابقہ مسلم خاندانوں کی تاریخ نے اورنگ زیب پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار اس ملک کے باشندوں کی خیر خواہی پر اتنا منحصر نہیں (جیسا کہ اس کے جدِ اکبر نے سوچا تھا) جتنا کہ خود حکمران قوم کی اپنی طاقت پر مبنی ہے۔ لیکن اپنے گہرے سیاسی شعور کے باوجود وہ اپنے اجداد کے کرتوتوں کو مٹا نہ سکا۔ سیواجی، اورنگ زیب کے عہد کی پیداوار نہیں تھا۔ اس کا وجود ان معاشرتی اور سیاسی عوامل کا مرہونِ منت ہے جو اکبر کی حکمتِ عملی سے ظہور میں آئے۔ اورنگ زیب کا سیاسی فہم و ادراک صائب ہونے کے باوجود، بعد از وقت ثابت ہوا تاہم اس کی سیاسی بصیرت کی اہمیت کے پیشِ نظر، اسے ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں میرے اس قول کی صداقت کو تسلیم کریں گی۔ انگریز حکمرانوں میں سے سب سے پہلے لارڈ کرزن نے ہندوستان میں انگلستان کے اقتدار کے بارے میں حقیقت شناسی کا ثبوت دیا۔ ہندو قومیت، بے جا طور پر اس کی پالیسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ زمانہ یقیناً یہ بتا دے گا کہ ہندو قومیت کا وجود لارڈ رپن کی پالیسی کا نتیجہ ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ سیاسی مقصد اور سیاسی ادراک میں مغل فرماں روا اور انگریز حکمران دونوں متفق ہیں۔ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انگریز مورخ لیول اورنگ زیب کو مطعون کرتا ہے، جس کے سامراجی نصب العین کی پیروی خود اس کے اہلِ ملک کرتے رہے ہیں اور جن کے سیاسی ادراک کی وہ توثیق کر چکے ہیں۔ اورنگ زیب کا سیاسی طریقِ کار یقیناً بہت بھدا تھا لیکن جس عہد سے اس کی زندگی اور اس کے کارنامے وابستہ ہیں، اسی کے نقطۂ نظر سے اس طریقِ کار کی اخلاقی حیثیت کو پرکھنا چاہیے۔"[۵۱۸]

اپنے ملک کی تاریخ کے علاوہ علّامہ کو دوسرے اسلامی ممالک کی تاریخ میں جو دلچسپی تھی، اس کی ترجمانی مندرجہ ذیل دو شذرات سے بخوبی ہوتی ہے:

(۱) فتح ایران: (۳۲) : اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ کون سا ہے تو میں

---

[۵۱۸] شذراتِ فکرِ اقبال، ص ۹۷ تا ۱۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے تامل کہوں گا، فتح ایران ۔ نہاوند کی جنگ نے عربوں کو ایک حسین ملک کے علاوہ ایک قدیم تہذیب بھی عطا کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک ایسی قوم سے روشناس ہوئے جو سامی اور آریائی عناصر کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی ۔ ہماری مسلم تہذیب، سامی اور آریائی پیوندکاری کا حاصل ہے ۔ گویا یہ اپنی اولاد ہے جسے آریائی ماں کی لطافت اور سامی باپ کے کردار کی پختگی و صلابت ورثے میں ملی ہے فتح ایران کے بغیر اسلامی تہذیب یک رخی رہ جاتی ہے ۔ فتح ایران سے ہمیں وہی کچھ حاصل ہو گیا جو فتح یونان سے رومیوں کو ملا تھا۔[19]

۲۔ افغانستان کا مستقبل (۲۵)؛ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ حائلی مملکتیں عظیم سیاسی وحدتوں کی صورت اختیار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں ۔ ملک شام جو سلطنت روما اور اہل فارس کے درمیان ایک حائلی مملکت تھا، اسی صورت حال سے دوچار رہا ۔ لہٰذا افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی دشوار ہے[20]

علامہ اقبال کا تاریخی تصور ہی قابل ستائش نہیں، اقتصادی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی قابل داد ہے ۔ دونوں کا حسین امتزاج اس شذرے میں ملاحظہ کیجیے:

لٹیری قومیں ــــ جب کوئی قوم محنت، مشقت یا کسی اور ذریعے سے دولت کے ذخیرے جمع کرتی ہے اور اس اکتناز زر کے نتیجے میں دنیا کے کاروبار کی گاڑی تھم جاتی ہے، جس کی رفتار مسلسل گردش زر پر منحصر ہے، تو لٹیری قومیں نمودار ہوتی ہیں اور مقید دولت کو آزاد کر دیتی ہیں ۔ وارن ہیسٹنگز، کلائیو اور محمود غزنوی ایسی قوموں کے مخصوص نمائندے ہیں جو کاروبار عالم کی ترقی میں فطرت کے غیر شعوری کارندوں کی حیثیت سے معاون ہوتی ہیں ۔ وارن ہیسٹنگز کی لوٹ کی صحیح توجیہہ و تفسیر ہمیں تاریخ کے اس باب میں ملے گی جہاں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے یورپی زر کا بیان ہے۔[21]

ملت اسلامیہ کی حیرت انگیز تاریخ کا احساس ان الفاظ میں دلاتے ہیں:

”مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ (۴۳) “مسلم قوم کی تاریخ پر آپ جتنا غور کریں گے، اتنا ہی اسے حیرت انگیز پائیں گے ۔ ابتدائی دور سے سولھویں صدی کے آغاز تک ــــ پورے ایک ہزار سال ــــ یہ توانا نسل (میں نسلی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اسلام نے ایک نسل ساز قوت کا کردار ادا کیا ہے)، سیاسی توسیع

---

۱۹ شذرات فکر اقبال ۔ ص ۱۰۰ ۲۰ ایضاً، ص ۸۹ ۲۱ ایضاً، ص ۱۲۰، ۱۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہمہ جاذب مشغلے میں پیہم منہمک رہی ہے، تاہم مسلسل جد و جہد کے اس طوفانی دور میں بھی، اس حیرت انگیز قوم نے بڑے بڑے تہذیبی کارنامے انجام دینے کے لیے کافی موقع نکال لیا۔ اس نے قدیم علوم کے مدفون خزانوں کو باہر نکالا اور محفوظ کیا۔ ان میں ٹھوس اضافے کیے۔ ایک منفرد نوعیت کا ادب تخلیق کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مکمل نظامِ قانون مرتب کیا جو ہمارے لیے مسلم فقہا کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔[۵۲]

اس سلسلے میں شذرات کے علاوہ علامہ کے انگریزی اور اردو خطوط بھی قابل توجہ ہیں۔

اسلامی تاریخ سے گہرے لگاؤ کا ثبوت علامہ کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ملتا ہے، جو ۱۲ جون ۱۹۳۲ء کو "انقلاب" (لاہور) میں بدیں صورت شائع ہوا تھا۔ اسلامی تاریخ کو نصاب سے خارج کرنے کے متعلق ارشادات:

پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا مضمون ۱۹۲۳ء میں شروع ہوا لیکن یونیورسٹی میں ہندو عنصر غالب ہونے کی وجہ سے اس مضمون کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر جے۔ ایف۔ بروس تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آئے تو انھوں نے ہندوؤں کے زیر اثر سینٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی تاریخ کو بی۔ اے پاس کورس سے خارج کر دیا جائے۔ یہ تجویز ایک رائے کی اکثریت سے منظور ہو گئی۔ مسلمانانِ پنجاب نے متعدد جلسے کر کے سخت مذمت کی، اسی سلسلے میں ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو ایک جلسہ باغ بیرون موچی دروازہ زیرِ اہتمام ریسرچ انسٹیٹیوٹ منعقد ہوا، جس کی صدارت علامہ سر محمد اقبال نے کی۔ خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا:

"زمانۂ قدیم میں بچوں کو ایک دعا پڑھائی جاتی تھی، شاید اب بھی وہ رواج قائم ہو۔ مجھے وہ دعا اب تک یاد ہے: اے اللہ! میرے دل سے غفلت کے پردے کو اٹھا لے۔ میرا آج تک یہی خیال تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ تمدن و تاریخ اسلام سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کوئی غیر مسلم۔ چند ماہ ہوئے مجھے مصر اور فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کے واقعات سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں۔ مصر میں قومیت کا جذبہ اور جوشِ عمل موجود ہے۔ وہاں ایک ادارہ قائم تھا جو ملکی تمدن و روایات کا محافظ تھا۔ فلسطین کی مؤتمر اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے نوجوان مقررین کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آ رہے تھے، انھیں علم و فضل اور جوشِ عمل کے اعتبار سے علمائے کرام پر فوقیت حاصل تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں تاریخِ اسلامی کی تعلیم کا کوئی

---

۵۲ شذرات فکر اقبال، ص ۱۳۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاص انتظام نہیں۔ لہٰذا میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ تاریخ اسلامی سے ناواقف اور قومی روایات سے نابلد طبقے کی راہنمائی کے لیے اسلامی تاریخ کے لیکچروں کا خاص بندوبست کرے۔ وہ لیکچر خواہ آسان اردو میں ہوں یا پنجابی میں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو تاریخ اسلامی سے آگاہی حاصل ہو جائے۔

اگر لاہور میں یہ انتظام ہو گیا تو میں امید کرتا ہوں کہ پنجاب کے دوسرے شہر بھی لاہور کی تقلید کریں گے۔

"اب میں نفسِ مضمون پر متوجہ ہوتا ہوں۔ ۱۹۲۳ء سے قبل اسلامی تاریخ نصاب میں داخل تھی۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں اسے بی۔ اے کے پاس نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ پاس اور آنرز دو جداگانہ کورس ہیں۔ مسٹر بروس کی تجویز ہے کہ اسے پاس کورس سے خارج کیا جائے اور آنرز اور ایم۔ اے میں اس مضمون کو بہت کم طلبا لیتے ہیں۔ پاس کورس میں طلبا کی زیادہ تعداد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کورس سے اسلامی تاریخ کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ عقلِ انسانی جب شرارت پر اُتر آتے تو اپنے اندرونی جذبات اور محرکات سے کام لے کر اپنے مقصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس نوع کے جذبات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ ایک علمی مسئلہ ہے، لہٰذا دلائل کا جواب دلائل سے دینا چاہیے۔ مسٹر بروس کی رپورٹ جو شائع ہوئی تھی، میری تحقیقات کے بموجب اس میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انھوں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ نصاب کے لیے عمدہ کتابیں نایاب ہیں یا قابل پروفیسر نہیں ملتے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے تو یہ خود ان کی جہالت کی دلیل ہوتی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے، روحِ انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔

"جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں روپے صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انھوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔

"اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کے مسلمانوں کے تقریباً مساوی ہوگی، پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس شعبے کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر متوجہ ہوں۔ انجمن حمایتِ اسلام کو چاہیے کہ ایسے ادارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا افتتاح کرے، جہاں تاریخ اسلامی کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو۔ لیکن انجمن تنہا اس کام کو انجام نہ دے سکے گی، بلکہ آپ لوگوں کی امداد کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے سے انجمن مسلمانوں کے مفاد سے غافل اور ان کے جذبات سے ناآشنا ہے اور بعض غرض مند ہاتھوں میں ایک کھلونا بنی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آزاد طبع اصحاب کو خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ کسی کو کوئی شکایت نہ رہے۔"

اس کے بعد یہ قرارداد منظور ہوئی۔

"مسلمانانِ لاہور کا یہ جلسہ ہندوستان کی تمام جدید و قدیم اسلامی درس گاہوں مثلاً مدرسۂ عالیہ دیوبند اور سہارن پور اور لکھنؤ وغیرہ کو تاریخ اسلامی کی تعلیم و ترویج کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اور تاریخ اسلامی کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا جائے۔"[۵۲۳]

نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ "یورپ سے ہمیں تین چیزیں ملی ہیں۔ (۱) انگریزی لٹریچر (۲) غور و فکر کی عادت —— درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے (۳) ڈیموکریسی —— جس کا ذاتی طور پر میں معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔"

"ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں، ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں، میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال بین ہوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چوں کہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں، اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطلع

---

۵۲۳ گفتارِ اقبال، محمد رفیق افضل، ص ۵۴ - ۱۵۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کر دے گی جو مطالعۂ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی[۵۲۴]

اعلیٰ سطح کے معلم کا کام صرف درس و تدریس نہیں ہوتا، وہ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے والوں کی راہنمائی بھی کرتا ہے۔ سید نذیر نیازی مکتوبات اقبال میں لکھتے ہیں کہ جب علامہ نے ۴ جون ۱۹۲۹ء کو خط میں انھیں یہ مشورہ دیا "بہتر ہو کہ آپ کسی اچھے ہنر کی تلاش میں ولایت جائیں" تو نذیر نیازی نے جواب میں عرض کیا "کسی سائنس یا صنعت کی تحصیل تو اب میری استطاعت سے باہر ہے۔ فلسفہ تاریخ کا موضوع کیا تصوف اسلام سے بہتر نہیں رہے گا"۔ اس کے جواب میں علامہ نے تحریر فرمایا "میں تصوف پر تاریخ کو ترجیح دیتا ہوں"۔

۱۰ اگست ۱۹۳۵ء کو نذیر نیازی کے نام خط میں تاریخ پنجاب کے ایک پہلو پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت کا احساس ان الفاظ میں دلاتے ہیں۔ "میرے خیال میں ایک نئی فیچر جو طلوع اسلام کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ سکھوں کے دور سے پہلے کی تاریخ پنجاب پر مفصل مضمون لکھے جائیں۔ چودھری صاحب سے اس بارے میں مشورہ کریں، انھوں نے حال ہی میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ میں اسے پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بیداری کے لیے اس حصہ تاریخ پر لکھنا ضروری ہے، باقی خیریت ہے۔ طلوع اسلام کے پہلے نمبر میں ہی ایک مضمون تاریخی ضروری ہے"۔

غلام قادر فصیح نے جب اپنا تاریخی نوعیت کا رسالہ شائع کرنا شروع کیا تو ان کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی۔ "میرے نزدیک یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لیے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں کہ اس قسم کے تاریخی رسالے شائع کیے جائیں، جن سے ان کو اسلاف کے حالات معلوم ہوں اور ان کے طرز عمل کا ان پر اثر پڑے۔ قوموں کی بیداری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی تاریخ سے کہاں تک دلچسپی ہے۔ آپ کے رسالے کی اشاعت سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان کہاں تک اپنے اسلاف کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

۵۲۴۔ گفتار اقبال ۔ محمد رفیق افضل ۔ ص ۱۰۵ ۔ ۱۰۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"حالاتِ موجودہ کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ایک قسم کی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور تاریخی مضامین کو نہایت توجہ سے سنا جاتا ہے۔ اس واسطے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا رسالہ برمحل نکلا ہے اور ہماری ضروریاتِ موجودہ کا کفیل ہوگا۔ خود مجھ پر جو اثر اس رسالے کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار میں اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کرسکتا کہ بسا اوقات دورانِ مطالعہ میں چشم پُرآب ہوجاتا ہوں، اس کا اثر میرے دل پر کئی دن رہتا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے۔"[۲۵]

حافظ فضل الرحمان انصاری کو ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے بلاتامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یورپ جانا بے سود ہے:

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کرکے محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمت اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے۔"[۲۶]

علامہ اقبال کی تخلیقات میں راہنمائی کا یہ میدان بہت وسیع ہے اور ان کی وسعتِ نظر کا عکاس ہے۔ دوسرے ممالک کے بسنے والوں کی راہنمائی کے لیے بھی وہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی کے پروفیسر خالد خلیل کے نام ان کے مندرجہ ذیل (انگریزی) خط کو ہم راہنمائی کے سلسلے میں ان کا شاہکار قرار دے سکتے ہیں:

مائی ڈیر خالد خلیل! میں آپ کو یہ خط سید سجاد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے مکتوب کے جواب میں لکھ رہا ہوں جنھوں نے کچھ عرصہ ہوا آپ کا خط یہاں اخبارات میں شائع کرایا اور خصوصاً مجھ سے ایسی تجاویز طلب کیں جو آپ کی معلمانہ مساعی و مشاغل میں معاون ہوسکیں۔ میرے نزدیک قسطنطنیہ یونیورسٹی کے ادارہ دینیات نے یہ نہایت دانشمندانہ کام کیا ہے۔ اگر اسلامی علم الانساب کا کام باقاعدہ طور پر کیا گیا تو غالباً ایسے انکشافات

---

[۲۵] شیخ عطاء اللہ — اقبال نامہ جلد دوم، ص ۲۷۶
[۲۶] ایضاً، دیباچہ، ص ۳۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بروئے کار آئیں گے جن سے دنیائے اسلام کی بابت ترکوں کا دائرۂ نظر وسیع تر ہو جائے گا اور اس طرح ممکن ہے کہ نوخیز نسل کا ذہنی اور روحانی نصب العین محکم تر ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی تحقیقات سے انسانی علوم کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا اور ممکن ہے نسلی خصوصیتوں کی تہ میں وحدتِ روح کے ایسے سامان دریافت ہو سکیں جن کا اندازہ سطحی مشاہدہ سے بمشکل لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو سکے کہ ایشیا کی سیرت کی تشکیل میں جس کا راز اب تک معلوم نہیں کیا جا سکا ہے، مہتم بالشان تاتاری نسل کی بعض اہم تر شاخیں کار فرما رہی ہوں۔ جو کام آپ کے پیشِ نظر ہے، اس کے امکانات بے پایاں ہیں اور مجھے یقین ہے، آپ اپنے خطباتِ علمی سے انسانیت، اسلام اور اپنے ملک و ملّت کی زبردست خدمات انجام دیں گے اور کم از کم دس سال کی مستقل سعی و محنت کے بعد آپ مللِ اسلام اور ان لوگوں کے لیے جو بطریقِ مختلفہ ان ملل سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک کلیتہً جدید نقطۂ نظر مہیا کر سکیں گے۔

۱۔ میں پہلے ایک عام تجویز پیش کروں گا۔ آپ کو ادارۂ دینیات کو مشورہ دینا چاہیے کہ جتنی کتابیں تاریخی یا اور قسم کی یورپین اور اسلامی زبانوں میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی ہیں، وہ ان سب کو فراہم کرے۔ یورپین کتابوں میں سے اکثر بلاشبہ خاص اغراض کو مدِّنظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہیں (مثلاً تبلیغی، سیاسی، تجارتی وغیرہ)، تاہم ان کتابوں میں کہیں کہیں آپ کو اپنے مضمون سے متعلق نہایت مفید معلومات ملیں گی۔ مثلاً مارشل کی "اسلام چین میں"، ایک مشنری نے مشنری اغراض کے لیے لکھی ہے۔ بایں ہمہ اس کتاب کے بعض حصص کے مطالعہ سے چینی مسلمانوں کے موجودہ نصب العین، ان کی تحریکات اور ان کی آرزوؤں کا پتا لگتا ہے۔ مصنف نے ان کی اصلیت کے متنازع فیہ مسئلہ، ان کی موجودہ آبادی، ان کے معابد اور ان کے ادب کی نوعیت سے بھی بحث کی ہے۔ ایک دوسری مثال سٹورڈ کی تصنیف "جدید دنیائے اسلام" ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو جنگِ عظیم کے بعد ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اور اس کے مصنف کا مقصد (جو اینگلو سیکسن نسل کی برتری کا قائل معلوم ہوتا ہے) محض ایک طرح کی سیاسی اشتہار بازی ہے۔ تاہم یہ ایک مفید کتاب یورپین زبانوں میں لکھی ہوئی ان کتابوں کے بے شمار حوالے دیتی ہے جو اسلام اور مللِ اسلامیہ پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جن کو سیاحوں یا حکومت ہائے یورپ کے ان سیاسی نمائندوں نے فرداً فرداً بعض اسلامی ممالک پر لکھا ہے، جہاں وہ متعین تھے۔ مثلاً برٹن اور فلبی (عرب)، گوبنو (فارس)، اور ویری (وسط ایشیا)۔ یہ وہی ویری ہے جس نے مرحوم سلطان عبدالحمید کو بتایا تھا کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے قبل ترک اپنے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخصوص رسم الخط کے مالک تھے۔

یہ سب کتابیں جمع کرنی چاہئیں اور اپنے خطبات کی ترتیب و تیاری میں آپ کو ان سے مدد لینی چاہیے۔ میسرز لوزک اینڈ کمپنی برٹش میوزیم لنڈن سے مراسلت کیجیے، ان کی فہرست کتب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپین مستشرقین نے اسلامی تمدن پر کتنا زبردست ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا لائپزگ (جرمنی) کے پروفیسر ڈاکٹر فشر سے مراسلت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے وہ آپ کے مضمون کے متعلق قیمتی مشورے دے سکیں گے۔ اگر آپ خود ان سے واقف نہیں تو خط میں میرا حوالہ دے دیجیے گا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر زویمر کا نام بھی لوں گا جو قاہرہ میں ایک مشنری ہیں۔ وہ اسلام کی مخالفت میں ایک رسالہ "مسلم ورلڈ" کی ادارت بھی کرتے ہیں، لیکن انھوں نے متعدد کتابوں اور مضامین کی صورت میں ملل اسلامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ گزشتہ سال وہ لاہور آئے تھے اور انھوں نے جرمن زبان میں مجھے ایک کتاب دکھائی تھی، جس میں اسلام اور ملل اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے۔ میں اس کے مصنف کا نام بھول گیا ہوں، مگر یہ آسانی سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر زویمر کو لکھیں تو وہ آپ کو بتا دیں گے۔ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اس سے اغلباً آپ کو ایسی کتابوں کے نام ملیں گے جو آپ کے مضمون سے متعلق ہیں۔ پروفیسر ہارو تز (فرینکفرٹ جرمنی) سے بھی مشورہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تصریحاً میں مشورہ دوں گا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مستقل طور پر پیش نظر رہے۔ اس میں آپ کو اسلامی ممالک مثلاً افغانستان، بلوچستان، کشمیر وغیرہ پر ان کی نسلی اور نسبی خصوصیات پر مضمون ملیں گے۔ فارس کے متعلق میں ETHNOGRAPHIC DE LA PERSE NICOLAS DE KHANIKIF کے مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔ یہ کسی قدر پرانی کتاب ہے، مگر اس سے آپ کو اپنے کام کی نوعیت اور ترتیب کا ایک عام اندازہ ہو جائے گا۔ MEMOIR SUR

۳۔ جہاں تک آپ کے خطبات کی ترتیب کا تعلق ہے، میں حسب ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔

شروع میں دو ایک ابتدائی خطبات ہوں، جن میں حسب ذیل امور پر بحث ہو:

(الف) علم وظائف الاعضا کے نقطۂ نظر سے نسل کی حیثیت۔

(ب) وہ اسباب جن سے نسلوں کی تفریق پیدا ہوئی۔

(ج) کیا مذہب ایک نسل آفریں عنصر ہے؟ بذاتہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تفریق لسانی کے باوجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا عالمِ اسلام کی ادبیات ایک مشترک پیش نہاد کی حامل ہیں ؟ بحیثیت مجموعی میرا خیال ہے کہ ایسا ہے۔

(د) اسلامی نسلوں کا ایک سرسری دائرہ۔

۱۔ سامی۔

(ا) عرب (ب) افغانی اور کشمیری۔ (کیا یہ عبرانی ہیں ؟)

۲۔ آریائی۔

(ا) ایرانی (ب) ہندی مسلمان، یہ مخلوط النسل ہیں، آریائی عنصر غالب ہے، جاٹ اور راجپوت جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے شاید تاتاری ہیں۔

۳۔ تاتاری۔

(ا) وسط ایشیا کے تاتاری (ب) منگولین (کاشغری اور تبتی)۔ (ج) چینی مسلمان (د) عثمانی ترک

۴۔ حبشی اور بربری۔

۵۔ علم الانساب کے اغراض و مقاصد۔

۴۔ میری رائے ہے کہ مثال کے طور پر افغانوں پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے:

خطبۂ اول — افغان، افغانستان میں نسلوں کا خلط ملط، فارسی بولنے والے افغان اور پشتو بولنے والے افغان۔ کیا افغان اور پٹھان میں کوئی چیز ما بہ الامتیاز ہے ؟ کیا افغان عبرانی ہیں۔ اپنی اصلیت کے متعلق اُن کی اپنی روایات۔ کیا پشتو زبان میں عبرانی الفاظ ملتے ہیں ؟ کیا وہ ان یہودیوں کے اخلاف ہیں جن کو ایرانی کسریٰ نے اسیر بن کی غلامی سے نجات دلائی تھی ؟ جدید افغانستان کے بڑے بڑے قبائل، ان کی تخمینی آبادی۔

خطبۂ دوم — افغانوں کے اسلام لانے کے زمانے سے ان کی سیاسی تاریخ پر سرسری تبصرہ۔

خطبۂ سوم — افغانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد۔

(ا) مذہبی۔ پیر روشن اور ان کے اخلاف

(ب) سیاسی۔ مشہور افغان شیر شاہ سوری، جس نے افغانانِ ہند کو متحد اور عارضی طور پر حکومتِ مغلیہ کو برطرف کر دیا تھا۔ اس کی تگ و دو کا صرف ہندوستان تک محدود رہنا۔

(ج) خوشحال خاں خٹک — سرحدی افغانوں کا زبردست سپاہی شاعر، جس نے ہندوستان کے مغلوں کے خلاف افغان قبیلوں کو متحد کرنا چاہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ افغان عبرانی النسل تھے۔ اس نے آخر شہنشاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اورنگ زیب سے شکست کھائی اور کسی ہندی قلعے میں قید کر دیا گیا۔ افغانوں کا شاید اولین قومی شاعر تھا۔

(د) احمد شاہ ابدالی

(ہ) مرحوم امیر عبدالرحمان خاں۔ موجودہ امیر اور افغانوں میں قومی تشخص پیدا کرنے کی جدوجہد۔

خطبۂ چہارم — موجودہ افغانی تمدن - ان کی قدیم اور جدید صنعت و صناعت، ان کی ادبیات، ان کی آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی ترجمان کی حیثیت سے۔

خطبۂ پنجم — افغانی نسل کا مستقبل۔

۵ - آخر میں ایک نہایت اہم تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، گو اس کا تعلق اس خط کے مضمون سے نہیں ہے۔ ادارۂ دینیات کو چاہیے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے جس پر کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر و تصور کا مطالعہ کیا ہو تاکہ وہ مسلم دینیات کو افکارِ جدیدہ کا ہم دوش بنا سکے۔

قدیم اسلامی دینیات کے (جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی حکمت و فکر تھا) تار پود بکھر چکے ہیں۔ اب وقت آ چکا ہے کہ اس کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ترکی حکومت کو چاہیے کہ جس طور پر وہ اور معاملات میں پیش قدمی کر رہی ہے، اس معاملے میں بھی پیش قدمی کرے۔ یورپ نے عقل و الہام کو ہم آہنگ بنانا ہم سے سیکھا ہے، وہ اپنے دینیات کو موجودہ فلسفے کی روشنی میں از سرِ نو تعمیر کرنے میں ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسلام کہ عیسائیت سے کہیں زیادہ عقلی مذہب ہے، اس شعبے میں کیوں بے حس و حرکت رہے۔ ادارۂ دینیات کو ایک جدید علمِ کلام کی طرح ڈالنی چاہیے اور ترکی کی نوخیز نسل کو یورپ کی لامذہبیت سے محفوظ و مصئون کر لینا چاہیے۔ مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیاتِ ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہو گا۔ شاید ایک نئی جنگ کی صورت میں وہ اپنی ہلاکت کا باعث خود ہو۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور"

علامہ کے شہ پاروں کے سہارے تاریخ میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا جائزہ لینے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راہنما اقبال کو ایک ایسے روپ میں دیکھیں جس میں شاعر اقبال اور مورخ اقبال یک جان و یک قالب نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتے ہیں۔ ان دو مختلف حیثیتوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ طویل تاریخی واقعات کو ایک یا چند اشعار میں پیش کرنے میں علامہ کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی سامراج نے جب کشمیر کو گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو علامہ نے فرمایا:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی — حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوی
دہقان و کشت و جوی و خیابان فروختند — قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

برصغیر میں آج کون ایسا ہے جو میر جعفر اور میر صادق کے نام سے واقف نہ ہو۔ علامہ نے جاوید نامے میں ان کے متعلق جو یہ ایک شعر کہا ہے، وہ تاریخ کے ایک سو صفحات پر بھاری ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن

اس کے بعد روحِ ہند کی زبان سے یہ شکایت زبان پر لاتے ہیں:

ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں — الاماں از جعفرانِ این زماں

غلام قادر روہیلہ کی فتح اور تیموریوں کی شکست کا بیان کسی تاریخ میں پڑھ کر ممکن ہے کہ قاری بھول جائے لیکن بانگِ درا میں شامل نظم بعنوان "غلام قادر روہیلہ" کے مندرجہ ذیل اشعار کو فراموش کرنا ناممکن ہے:

روہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا — نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے — یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے
یونہیں کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اس کی — کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ خنجر سے
کمر سے اٹھ کے تیغِ جاں ستاں آتش فشاں کھولی — سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے — شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا — کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی — مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز کھل گیا سارے زمانے پر — حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

علامہ کی اسی قسم کی نظموں اور اسی انداز کے اشعار کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین اردو شاعری میں رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ اور شعرا کے اقبال و بیکسیت نے مختلف اشخاص کے کردار بیان کرکے اردو ادب کے نظریے کو وسیع کرنے کی بڑی کوششیں کی ہیں — دورِ حاضر میں امام حسین کے ایثار و استقلال کو جتنا سراہا گیا ہے، اتنا کسی دوسری ہستی کو اردو شاعری میں غزل و نظم میں جگہ نہیں دی۔ اقبال، حفیظ، جوش کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی قومی مجاہد کی بہترین مثال میں امام حسین کو یاد کیا ہے۔" [۵۲]

میرا خیال ہے کہ حادثۂ کربلا کو علامہ نے رموزِ بےخودی میں جس طرح تاریخی حقیقت کو برقرار رکھتے ہوئے دلنشین اور موثر صورت میں پیش کیا ہے، وہ تاریخ اور شاعری کے حسین امتزاج کی ایک لاجواب کوشش ہے۔ حضرت حسین کی شان میں کہے گئے مندرجہ ذیل اشعار کو ہم معنوی اعتبار سے قصیدہ کے شعر کہہ سکتے ہیں، لیکن ان میں مبالغہ بالکل نہیں، تاریخی حقائق بیان کیے گئے ہیں:

آں امامِ عاشقاں پورِ بتول ؓ — سروِ آزادے ز بستانِ رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل
رمزِ قرآں از حسین آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

میں آخر میں اس حقیقت کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں علامہ کی تاریخی یا نیم تاریخی نوعیت کی جملہ تحریریں شامل نہیں۔ اس موضوع پر تحقیقی کام کی بہت ضرورت ہے۔

---

[۵۲] ڈاکٹر اعجاز حسین — نئے ادبی رجحانات، ص ۶-۱۸۵

© rasailojaraid.com